© rasailojaraid.com

تفہیم القرآن

محمد

نام | آیت نمبر ۲ کے فقرے وَّاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ سے ماخوذ ہے یعنی وہ سورۃ جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آیا ہے۔ اِس کے علاوہ اس کا ایک اور مشہور نام "قِتَال" بھی ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مضامین یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ہجرت کے بعد مدینۂ طیبہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہے جب جنگ کا حکم نازل ہو چکا تھا، مگر ابھی جنگ عملاً شروع نہ ہوئی تھی۔ اس کے مفصل دلائل آگے حاشیہ ۸ میں ملیں گے۔

تاریخی پس منظر | جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اُس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں خاص طور پر اور عرب کی سرزمین میں بالعموم ہر جگہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر مدینۂ طیبہ کے دارالامان میں جمع ہو گئے تھے، مگر کفارِ قریش یہاں بھی ان کو چین سے بیٹھنے دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی ہر طرف سے کفار کے نرغے میں گھری ہوئی تھی اور وہ اسے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کے لیے اس حالت میں دو ہی چارۂ کار باقی رہ گئے تھے، یا تو وہ دینِ حق کی دعوت و تبلیغ ہی سے نہیں بلکہ اس کی پیروی تک سے دست بردار ہو کر جاہلیت کے آگے سپر ڈال دیں، یا پھر مرنے مارنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور سردھڑ کی بازی لگا کر ہمیشہ کے لیے اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ عرب کی سرزمین میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کو رہنا ہے یا جاہلیت کو۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو اُسی عزیمت کی راہ دکھائی جو اہلِ ایمان کے لیے ایک ہی راہ ہے۔ اُس نے پہلے سورۂ حج (آیت ۳۹) میں ان کو جنگ کی اجازت دی، اور پھر سورۂ بقرہ (آیت ۱۹۰) میں اس کا حکم دے دیا۔ مگر اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ اِن حالات میں جنگ کے معنی کیا ہیں۔ مدینے میں اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جمعیت تھی جو پورے ایک ہزار مردانِ جنگی بھی فراہم کرنے کے قابل نہ تھی، اور اس سے کہا جا رہا تھا کہ سارے عرب کی جاہلیت سے ٹکرا جانے کے لیے تلواریں لے کر کھڑی ہو جائے۔ پھر لڑائی کے لیے جس سرو سامان کی ضرورت تھی وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی ایک ایسی بستی مشکل ہی سے فراہم کر سکتی تھی جس کے اندر سینکڑوں بے خانماں مہاجر ابھی پوری طرح بسے بھی نہ تھے اور چاروں طرف سے اہلِ عرب نے معاشی مقاطعہ کر کے اُس کی کمر توڑ رکھی تھی۔

موضوع اور مضمون یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل فرمائی گئی۔ اس کا موضوع اہلِ ایمان کو جنگ کے لیے تیار کرنا اور ان کو اِس سلسلہ میں ابتدائی ہدایات دینا ہے اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ قتال بھی رکھا گیا ہے۔ اس میں ترتیب وار حسبِ ذیل مضامین ارشاد ہوتے ہیں:

آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اِس وقت دو گروہوں کے درمیان مقابلہ درپیش ہے۔ ایک گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ حق کو ماننے سے انکار کر چکا ہے اور اللہ کے راستہ میں سدِّ راہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور دوسرے گروہ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ اُس حق کو مان گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کا دو ٹوک فیصلہ یہ ہے کہ پہلے گروہ کی تمام سعی و عمل کو اس نے رائیگاں کر دیا، اور دوسرے گروہ کے حالات درست کر دیئے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ابتدائی جنگی ہدایات دی گئی ہیں۔ ان کو اللہ کی مدد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور رہنمائی کا یقین دلایا گیا ہے۔ ان کو اللہ کی راہ میں قربانیاں کرنے پر بہترین اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ اور انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ راہِ حق میں ان کی کوششیں رائیگاں نہ جائیں گی بلکہ دنیا سے لیکر آخرت تک وہ ان کا اچھے سے اچھا پھل پائیں گے۔

پھر کفار کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی تائید و رہنمائی سے محروم ہیں۔ ان کی کوئی تدبیر اہلِ ایمان کے مقابلے میں کارگر نہ ہوگی اور وہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہت بُرا انجام دیکھیں گے۔ انہوں نے اللہ کے نبی کو مکّہ سے نکال کر یہ سمجھا کہ انہیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے، حالانکہ دراصل یہ کام کرکے انہوں نے اپنی تباہی کو خود اپنے اوپر دعوت دے دی۔

اس کے بعد منافقین کی طرف رُوئے سخن پھرتا ہے جو جنگ کا حکم آنے سے پہلے تو بڑے مسلمان بنے پھرتے تھے۔ مگر یہ حکم آجانے کے بعد ان کے ہوش اڑ گئے تھے اور وہ اپنی عافیت کی فکر میں کفار سے ساز باز کرنے لگے تھے تاکہ اپنے آپ کو جنگ کے خطرات سے بچالیں۔ ان کو صاف صاف خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کے معاملہ میں منافقت اختیار کرنے والوں کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ یہاں تو بنیادی چیز یہ ہے کہ آدمی حق کے ساتھ ہے یا باطل کے ساتھ۔ اس کی ہمدردیاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہیں یا کفر اور کفار کے ساتھ۔ وہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کو عزیز رکھتا ہے یا اُس حق کو جس پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ اس آزمائش میں جو شخص کھوٹا نکلتا ہے وہ مومن ہی نہیں ہے، کجا کہ اس کی نماز اور اس کا روزہ اور اس کی زکوٰۃ خدا کے ہاں کسی اجر کی مستحق ہو۔

پھر مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور اُن کے سروسامان کی فراوانی دیکھ کر ہمت نہ ہاریں، اُن کے آگے صلح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی پیش کش کرکے کمزوری کا اظہار نہ کریں جس سے اُن کی جرأتیں اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اور زیادہ بڑھ جائیں، بلکہ اللہ کے بھروسے پر اٹھیں اور کفر کے اس پہاڑ سے ٹکرا جائیں۔ اللہ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ وہی غالب رہیں گے۔ اور یہ پہاڑ ان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

آخر میں مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی گئی ہے۔ اگرچہ اُس وقت مسلمانوں کی معاشی حالت بہت پتلی تھی، مگر سامنے مسئلہ یہ درپیش تھا کہ عرب میں اسلام اور مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے کی اہمیت و نزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے دین کو کفر کے غلبہ سے بچانے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اپنی جانیں بھی لڑائیں اور جنگی تیاری میں اپنے مالی وسائل بھی پوری امکانی حد تک کھپا دیں۔ اس لیے مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اِس وقت جو شخص بھی بخل سے کام لیگا وہ دراصل اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا بلکہ خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے خطرے میں ڈال لے گا۔ اللہ تو انسانوں کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے دین کی خاطر قربانیاں کرنے سے ایک گروہ اگر جی چرائے گا تو اللہ اسے ہٹا کر دوسرا گروہ اس کی جگہ لے آئے گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

جن لوگوں نے کفر کیا[۱] اور اللہ کے راستے سے روکا[۲]، اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں

---

[۱] یعنی اُس تعلیم و ہدایت کو ماننے سے انکار کر دیا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے تھے۔

[۲] اصل میں صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ صَدّ عربی زبان میں لازم اور متعدی، دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اِن الفاظ کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خود اللہ کے راستے پر آنے سے باز رہے، اور یہ بھی کہ انہوں نے دوسروں کو اس راہ پر آنے سے روکا۔ دوسروں کو خدا کی راہ سے روکنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اِس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کردیا؎۲۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اُس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل

زبردستی کسی کو ایمان لانے سے روک دے۔ دوسری صورت یہ کہ وہ ایمان لانے والوں پر ایسا ظلم وستم ڈھائے کہ اُن کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور دوسروں کے لیے ایسے خوفناک حالات میں ایمان لانا مشکل ہوجائے۔ تیسری صورت یہ کہ وہ مختلف طریقوں سے دین اور اہلِ دین کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ایسے وسوسے دلوں میں ڈالے جس سے لوگ اِس دین سے بدگمان ہوجائیں۔ اس کے علاوہ ہر کافر اس معنی میں خدا کی راہ سے روکنے والا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کفر کے طریقے پر پرورش کرتا ہے اور پھر اس کی آئندہ نسل کے لیے دینِ آبائی کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ہر کافر معاشرہ خدا کے راستے میں ایک سنگِ گراں ہے، کیونکہ وہ اپنی تعلیم و تربیت سے، اپنے اجتماعی نظام اور رسم و رواج سے، اور اپنے تعصبات سے دینِ حق کے پھیلنے میں شدید رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

۳؎ اصل الفاظ ہیں اَضَلَّ اعمالہم۔ یہ الفاظ بڑے وسیع مفہوم کے حامل ہیں۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ توفیق سلب کرلی کہ ان کی کوششیں اور محنتیں صحیح راستے میں صرف ہوں۔ اب وہ جو کچھ بھی کریں گے غلط مقاصد کے لیے غلط طریقوں ہی سے کریں گے اور ان کی تمام سعی وجہد ہدایت کے بجائے ضلالت ہی کی راہ میں صرف ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کام اپنے نزدیک وہ خیر کے کام سمجھ کر کرتے رہے ہیں، مثلاً خانۂ کعبہ کی نگہبانی، حاجیوں کی خدمت، مہمانوں کی ضیافت، رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی، اور ایسے ہی دوسرے کام جنہیں عرب میں مذہبی خدمات اور مکارمِ اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ضائع کردیا۔ اُن کا کوئی اجر و ثواب ان کو نہ ملے گا، کیونکہ جب وہ اللہ کی توحید اور صرف اُسی کی عبادت کا طریقہ اختیار کرنے سے انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اِس راہ پر آنے سے روکتے ہیں تو ان کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوسکتا۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ راہِ حق کو روکنے اور اپنے کافرانہ مذہب کو عرب میں زندہ رکھنے کے لیے جو کوششیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کر رہے ہیں، اللہ نے ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی ہیں ـــــــ جو سراسر حق ہے ان کے رب کی طرف سے ـــــــ اللہ نے ان کی برائیاں اُن سے دُور کر دیں[۵] اور ان کا حال درست کر دیا[۶]۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے اُس حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔

رائیگاں کر دیا۔ ان کی ساری تدبیریں اب محض ایک تیرِ بے ہدف ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے مقصد کو ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔

[۴] اگرچہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہنے کے بعد اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ایمان لانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر نازل ہونے والی تعلیمات پر ایمان لانا آپ سے آپ شامل ہے۔ لیکن اس کا الگ ذکر خاص طور پر یہ جتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہو جانے کے بعد کسی شخص کا خدا اور آخرت اور پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کو ماننا بھی اُس وقت تک نافع نہیں ہے جب تک کہ وہ آپؐ کو اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ مان لے۔ یہ تصریح اس لیے ضروری تھی کہ ہجرت کے بعد اب مدینہ طیبہ میں اُن لوگوں سے بھی سابقہ درپیش تھا جو ایمان کے دوسرے تمام لوازم کو تو مانتے تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے۔

[۵] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جاہلیت کے زمانے میں جو گناہ ان سے سرزد ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ سب ان کے حساب سے ساقط کر دیئے۔ اب اُن پر کوئی بازپرس ان سے نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ عقائد اور خیالات اور اخلاق اور اعمال کی جن خرابیوں میں وہ مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ نے وہ اُن سے دور کر دیں۔ اُن کے ذہن بدل گئے۔ اُن کے عقائد اور خیالات بدل گئے۔ ان کی عادتیں اور خصلتیں بدل گئیں۔ ان کی سیرتیں اور ان کے کردار بدل گئے۔ اب اُن کے اندر جاہلیت کی جگہ ایمان ہے اور بدکرداریوں کی جگہ عملِ صالح۔

[۶] اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ پچھلی حالت کو بدل کر آئندہ کے لیے اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اُس کے پورے سیاق و سباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اُس اُمت کے لیے دین تھی اور اُس کے دَورِ نبوت میں اُسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دَورِ نبوت ہے، اس لیے امتِ محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اس دَور کے لیے دین ہے اور اُس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا، اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے اُنہی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا، اور اب اقامتِ دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق انہیں ادا کیا جائے۔ انہی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

قرآنِ مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوف کے مارے مدینے کے منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کا حال یہ ہو رہا تھا کہ جیسے اُن پر موت چھا گئی ہو۔ اِس کے علاوہ سورۂ انفال کی آیات ۶۷ - ۶۹ بھی اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ آیت جنگِ بدر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ:

"کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے۔"

اس عبارت اور خصوصاً اس کے خط کشیدہ فقروں پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس موقع پر عتاب جس بات پر ہوا تھا وہ یہ تھی کہ جنگِ بدر میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل دینے سے پہلے مسلمان دشمن کے آدمیوں کو قید کرنے میں لگ گئے تھے، حالانکہ جنگ سے پہلے جو ہدایت سورۂ محمدؐ میں ان کو دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ "جب تم اُن کو اچھی طرح کچل دو تو پھر قیدیوں کو مضبوط باندھو"۔ تاہم، چونکہ سورۂ محمدؐ میں مسلمانوں کو قیدیوں سے فدیہ لینے کی اجازت دی جا چکی تھی اس لیے جنگِ بدر کے قیدیوں سے جو مال لیا گیا اسے اللہ نے حلال قرار دیا اور مسلمانوں کو اس کے لینے پر سزا نہ دی۔ "اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا" کے الفاظ اس امر کی طرف صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے فدیہ لینے کی اجازت کا فرمان قرآن میں آ چکا تھا، اور قرآن کے اندر سورۂ محمدؐ کی اِس آیت کے سوا کوئی دوسری آیت ایسی نہیں ہے جس میں یہ فرمان پایا جاتا ہو، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ آیت سورۂ انفال کی مذکورۂ بالا آیت سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۱۵۹ - ۱۶۱۔

یہ قرآن مجید کی پہلی آیت ہے جس میں قوانینِ جنگ کے متعلق ابتدائی ہدایات دی گئی ہیں۔ اِس سے جو احکام نکلتے ہیں، اور اس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے جس طرح عمل

© rasailojaraid.com

کیا ہے، اور فقہاء نے اس آیت اور سنّت سے جو استنباطات کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جنگ میں مسلمانوں کی فوج کا اصل ہدف دشمن کی جنگی طاقت کو توڑ دینا ہے، یہاں تک کہ اس میں لڑنے کی سکت نہ رہے اور جنگ ختم ہو جائے۔ اس ہدف سے توجہ ہٹا کر دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کرنے میں نہ لگ جانا چاہیے۔ قیدی پکڑنے کی طرف توجہ اُس وقت کرنی چاہیے جب دشمن کا اچھی طرح قلع قمع کر دیا جائے اور میدانِ جنگ میں اس کے کچھ آدمی باقی رہ جائیں۔ اہلِ عرب کو یہ ہدایت آغاز ہی میں اس لیے دے دی گئی کہ وہ کہیں فدیہ حاصل کرنے، یا غلام فراہم کرنے کے لالچ میں پڑ کر جنگ کے اصل ہدفِ مقصود کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔

(۲) جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں اُن کے بارے میں فرمایا گیا کہ تمہیں اختیار ہے، خواہ ان پر احسان کرو، یا ان سے فدیہ کا معاملہ کر لو۔ اس سے عام قانون یہ نکلتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حسن بصری، عطاء اور حمّاد بن ابی سلیمان، قانون کے اسی عموم کو لیتے ہیں، اور یہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو قتل لڑائی کی حالت میں کیا جا سکتا ہے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی اور قیدی ہمارے قبضے میں آ گیا تو اسے قتل کرنا درست نہیں ہے۔ ابن جریر اور ابوبکر جصّاص کی روایت ہے کہ حجّاج بن یوسف نے جنگی قیدیوں میں سے ایک قیدی کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالہ کیا اور حکم دیا کہ اسے قتل کر دیں۔ انہوں نے انکار کر دیا اور یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ ہمیں قید کی حالت میں کسی کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ امام محمد نے السیر الکبیر میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک جنگی قیدی کے قتل کا حکم دیا تھا اور انہوں نے اسی بنا پر اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا۔

(۳) مگر چونکہ اس آیت میں قتل کی صاف ممانعت بھی نہیں کی گئی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا منشا یہ سمجھا اور اسی پر عمل بھی فرمایا کہ اگر کوئی خاص وجہ ایسی ہو جس کی بنا پر اسلامی حکومت کا فرمانروا کسی قیدی یا بعض قیدیوں کو قتل کرنا ضروری سمجھے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ یہ عام قاعدہ نہیں ہے بلکہ قاعدۂ عام میں ایک استثناء ہے جسے بضرورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی استعمال کیا جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے ۰۰ قیدیوں میں سے صرف عُقبَہ بن ابی مُعیط اور نَضر بن الحارِث کو قتل کیا۔ جنگ اُحُد کے قیدیوں میں سے صرف ابوعزہ شاعر کو قتل فرمایا۔ بنی قُرَیظہ نے چونکہ اپنے آپ کو حضرت سعد بن مُعاذ کے فیصلے پر حوالے کیا تھا اور ان کے اپنے تسلیم کردہ حَکَم کا فیصلہ یہ تھا کہ ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، اس لیے آپ نے ان کو قتل کرا دیا۔ جنگ خیبر میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سے صرف کِنانہ ابن ابی الحُقَیق قتل کیا گیا کیونکہ اس نے بدعہدی کی تھی۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے تمام اہلِ مکہ میں سے صرف چند خاص اشخاص کے متعلق حکم دیا کہ ان میں سے جو بھی پکڑا جائے وہ قتل کر دیا جائے۔ ان مستثنیات کے سوا حضورؐ کا عام طریقہ اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا کبھی نہیں رہا۔ اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی تھا۔ ان کے زمانے میں بھی قتلِ اسیرانِ جنگ کی مثالیں شاذونادر ہی ملتی ہیں اور ہر مثال میں قتل کسی خاص وجہ سے کیا گیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اپنے پورے زمانۂ خلافت میں صرف ایک جنگی قیدی کو قتل کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ اسی بنا پر جمہور فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی حکومت اگر ضرورت سمجھے تو اسیر کو قتل کر سکتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے۔ ہر فوجی اس کا مجاز نہیں ہے کہ جس قیدی کو چاہے قتل کر دے۔ البتہ اگر قیدی کے فرار ہونے کا یا اُس سے کسی خطرناک شرارت کا اندیشہ ہو جائے تو جس شخص کو بھی اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے وہ اسے قتل کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے اسلام نے تین تصریحات اور بھی کی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر قیدی اسلام قبول کر لے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قیدی صرف اُسی وقت تک قتل کیا جا سکتا ہے جب تک وہ حکومت کی تحویل میں ہو۔ تقسیم یا بیع کے ذریعہ سے اگر وہ کسی شخص کی ملک میں جا چکا ہو تو پھر اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرے یہ کہ قیدی کو قتل کرنا ہو تو بس سیدھی طرح قتل کر دیا جائے، عذاب دے دے کر نہ مارا جائے۔

(۴) جنگی قیدیوں کے بارے میں عام حکم جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یا اُن پر احسان کرو، یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فدیے کا معاملہ کرلو۔

احسان میں چار چیزیں شامل ہیں : ایک یہ کہ قید کی حالت میں اُن سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قتل یا دائمی قید کے بجائے ان کو غلام بنا کر افرادِ مسلمین کے حوالہ کر دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ جزیہ لگا کر ان کو ذمّی بنا لیا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کو بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔

فدیے کا معاملہ کرنے کی تین صورتیں ہیں : ایک یہ کہ مالی معاوضہ لے کر انہیں چھوڑا جائے۔ دوسرے یہ کہ رہائی کی شرط کے طور پر کوئی خاص خدمت لینے کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اپنے اُن آدمیوں سے جو دشمن کے قبضے میں ہوں، اُن کا تبادلہ کر لیا جائے۔

ان سب مختلف صورتوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے مختلف اوقات میں حسبِ موقع عمل فرمایا ہے۔ خدا کی شریعت نے اسلامی حکومت کو کسی ایک ہی شکل کا پابند نہیں کر دیا ہے۔ حکومت جس وقت جس طریقے کو مناسب ترین پائے اُس پر عمل کر سکتی ہے۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ ایک جنگی قیدی جب تک حکومت کی قید میں رہے، اُس کی غذا اور لباس، اور اگر وہ بیمار یا زخمی ہو تو اس کا علاج، حکومت کے ذمہ ہے۔ قیدیوں کو بھوکا ننگا رکھنے، یا ان کو عذاب دینے کا کوئی جواز اسلامی شریعت میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حسنِ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت بھی کی گئی ہے، اور عملاً بھی اسی کی نظیریں سُنّت میں ملتی ہیں۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ کے گھروں میں بانٹ دیا اور ہدایت فرمائی کہ استوصوا بالاساری خیرًا "ان قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا"۔ اُن میں سے ایک قیدی، ابوعزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے گھر میں رکھا گیا تھا وہ صبح شام مجھ کو روٹی کھلاتے تھے اور خود صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔ ایک اور قیدی سُہیل بن عَمْرو کے متعلق حضور سے کہا گیا کہ یہ بڑا آتش بیان مقرر ہے، آپ کے خلاف تقریریں کرتا رہا ہے، اِس کے دانت تڑوا دیجیے۔ حضور نے جواب دیا "اگر میں اس کے دانت تڑواؤں تو اللہ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں" (سیرت ابن ہشام)۔ یمامہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سردار ثمامہؓ بن اُثال جب گرفتار ہو کر آئے تو جب تک وہ قید میں رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمدہ کھانا اور دودھ ان کے لیے مہیا کیا جاتا رہا (ابن ہشام)۔ یہی طرزِ عمل صحابہ کرام کے دور میں بھی رہا۔ جنگی قیدیوں سے بُرے سلوک کی کوئی نظیر اُس دور میں نہیں ملتی۔

(۶) قیدیوں کے معاملے میں یہ شکل اسلام نے سرے سے اپنے ہاں رکھی ہی نہیں ہے کہ ان کو ہمیشہ قید رکھا جاتے اور حکومت اُن سے جبری محنت لیتی رہے۔ اگر اُن کے ساتھ تبادلے یا فدیے کا کوئی معاملہ نہ ہو تو اُن کے معاملے میں احسان کا طریقہ یہ رکھا گیا ہے کہ انہیں غلام بنا کر افراد کی ملکیت میں دے دیا جائے اور اُن کے مالکوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی اس طریقے پر عمل کیا گیا ہے، صحابۂ کرام کے عہد میں بھی یہ جاری رہا ہے، اور فقہائے اسلام بالاتفاق اِس کے جواز کے قائل ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ جو شخص قید میں آنے سے پہلے اسلام قبول کر چکا ہو اور پھر کسی طرح گرفتار ہو جائے وہ تو آزاد کر دیا جائے گا، مگر جو شخص قید ہونے کے بعد اسلام قبول کرے، یا کسی شخص کی ملکیت میں دے دیئے جانے کے بعد مسلمان ہو تو یہ اسلام اس کے لیے آزادی کا سبب نہیں بن سکتا۔ مُسند احمد، مسلم، اور ترمذی میں حضرت عمران بن حُصَین کی روایت ہے کہ بنی عُقَیل کا ایک شخص گرفتار ہو کر آیا اور اُس نے کہا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لو قلتھا وانت تملك امرك افلحت كل الفلاح "اگر یہ بات تو نے آزاد ہونے کی حالت میں کہی ہوتی تو یقیناً فلاح پا جاتا"۔ یہی بات حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے کہ اذا اسلم الاسیر فی ایدی المسلمین فقد امن من القتل وھو رقیق "جب قیدی مسلمانوں کے قبضے میں آنے کے بعد مسلمان ہو تو وہ قتل سے تو محفوظ ہو جائے گا مگر غلام رہے گا"۔ اسی بنا پر فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قید ہونے کے بعد مسلمان ہونے والا غلامی سے نہیں بچ سکتا (السیر الکبیر، امام محمد)۔ اور یہ بات سراسر معقول بھی ہے۔ اگر ہمارا قانون یہ ہوتا کہ جو شخص بھی گرفتار ہونے کے بعد اسلام قبول کر لے گا وہ آزاد کر دیا جائے گا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو آخر وہ کونسا نادان قیدی ہوتا جو کلمہ پڑھ کر رہائی نہ حاصل کر لیتا۔

(۷) قیدیوں کے ساتھ احسان کی تیسری صورت اسلام میں یہ رکھی گئی ہے کہ جزیہ لگا کر ان کو دارالاسلام کی ذمّی رعایا بنا لیا جائے اور وہ اسلامی مملکت میں اُسی طرح آزاد ہو کر رہیں جس طرح مسلمان رہتے ہیں۔ امام محمد السیر الکبیر میں لکھتے ہیں کہ "ہر وہ شخص جس کو غلام بنانا جائز ہے اُس پر جزیہ لگا کر اُسے ذمّی بنا لینا بھی جائز ہے" اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں "مسلمانوں کے فرمانروا کو یہ حق ہے کہ اُن پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر خراج لگا کر انہیں اصلاً آزاد قرار دے دے" اس طریقے پر بالعموم اُن حالات میں عمل کیا گیا ہے جبکہ قید ہونے والے لوگ جس علاقے کے باشندے ہوں وہ مفتوح ہو کر اسلامی مملکت میں شامل ہو چکا ہو۔ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اہلِ خیبر کے معاملہ میں یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا، اور پھر حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق اور دوسرے علاقوں کی فتح کے بعد بڑے پیمانے پر اس کی پیروی کی۔ ابو عُبید نے کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ عراق کی فتح کے بعد اُس علاقے کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین، پہلے اہلِ ایران ہم پر مسلط تھے۔ انہوں نے ہم کو بہت ستایا، بُرا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا اور طرح طرح کی زیادتیاں ہم پر کرتے رہے۔ پھر جب خدا نے آپ لوگوں کو بھیجا تو ہم آپ کی آمد سے بڑے خوش ہوتے اور آپ کے مقابلے میں نہ کوئی مدافعت ہم نے کی نہ جنگ میں کوئی حصّہ لیا۔ اب ہم نے سنا ہے کہ آپ ہمیں غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "تم کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جاؤ، یا جزیہ قبول کر کے آزاد رہو۔" ان لوگوں نے جزیہ قبول کر لیا اور وہ آزاد چھوڑ دیئے گئے۔ ایک اور جگہ اسی کتاب میں ابو عُبید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو لکھا کہ "جنگ میں جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان میں سے ہر کاشت کار اور کسان کو چھوڑ دو۔"

(۸) احسان کی چوتھی صورت یہ ہے کہ قیدی کو بلا کسی فدیے اور معاوضے کے یونہی رہا کر دیا جائے۔ یہ ایک خاص رعایت ہے جو اسلامی حکومت صرف اُسی حالت میں کر سکتی ہے جبکہ کسی خاص قیدی کے حالات اس کے متقاضی ہوں، یا توقع ہو کہ یہ رعایت اُس قیدی کو ہمیشہ کے لیے ممنونِ احسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دے گی اور وہ دشمن سے دوست یا کافر سے مومن بن جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دشمن قوم کے کسی شخص کو اس لیے چھوڑ دینا کہ وہ پھر ہم سے لڑنے آجائے کسی طرح بھی تقاضائے مصلحت نہیں ہو سکتا اسی لیے فقہائے اسلام نے بالعموم اس کی مخالفت کی ہے، اور اس کے جواز کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ "اگر امامِ مسلمین قیدیوں کو، یا ان میں سے بعض کو بطور احسان چھوڑ دینے میں مصلحت پائے تو ایسا کرنے میں مضائقہ نہیں ہے" (السیر الکبیر)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں اور قریب قریب سب میں مصلحت کا پہلو نمایاں ہے۔

جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق آپ نے فرمایا لوکان المطعم بن عدیٍّ حیًّا ثم کلمنی فی ھؤلاء النتنٰی لترکتھم لہٗ (بخاری، ابوداؤد، مسند احمد)۔ "اگر مُطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے اِن گھناؤنے لوگوں کے بارے میں بات کرتا تو میں اس کی خاطر انہیں یونہی چھوڑ دیتا" یہ بات حضورؐ نے اِس لیے فرمائی تھی کہ آپ جب طائف سے مکّہ معظمہ واپس ہوئے تھے اس وقت مُطعم ہی نے آپ کو اپنی پناہ میں لیا تھا اور اُس کے لڑکے ہتھیار باندھ کر اپنی حفاظت میں آپ کو حرم میں لے گئے تھے۔ اس لیے آپ اُس کے احسان کا بدلہ اِس طرح اُتارنا چاہتے تھے۔

بخاری، مسلم، اور مسند احمد کی روایت ہے کہ یمامہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضورؐ نے ان سے پوچھا "ثمامہ، تمہارا کیا خیال ہے؟" انہوں نے کہا "اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کا خون کچھ قیمت رکھتا ہے، اگر مجھ پر احسان کریں گے تو ایسے شخص پر کریں گے جو احسان ماننے والا ہے، اور اگر آپ مال لینا چاہتے ہیں تو مانگیے، آپ کو دیا جائے گا"۔ تین دن تک آپ ان سے یہی بات پوچھتے رہے اور وہ یہی جواب دیتے رہے۔ آخر کار آپ نے حکم دیا کہ ثُمامہ کو چھوڑ دو۔ رہائی پاتے ہی وہ قریب کے ایک نخلستان میں گئے، نہا دھو کر واپس آئے، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے اور عرض کیا کہ "آج سے پہلے کوئی شخص میرے لیے آپ سے اور کوئی دین آپ کے دین سے بڑھ کر مبغوض نہ تھا، مگر اب کوئی شخص اور کوئی دین مجھے آپ سے اور آپ کے دین سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے"۔ پھر وہ عُمرہ کے لیے مکّے گئے اور وہاں قریش کے لوگوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوٹس دے دیا کہ آج کے بعد کوئی غلہ تمہیں یمامہ سے نہ پہنچے گا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مکہ والوں کو حضورؐ سے التجا کرنی پڑی کہ یمامہ سے ہمارے غلہ کی رسد بند نہ کرائیں۔

بنی قُرَیظہ کے قیدیوں میں سے آپؐ نے زَبیر بن باطا اور عَمرو بن سعد (یا ابن سُعدیٰ) کی جاں بخشی کی۔ زبیر کو اس لیے چھوڑا کہ اس نے جاہلیت کے زمانے میں جنگ بُعاث کے موقع پر حضرت ثابت بن قیس انصاری کو پناہ دی تھی، اس لیے آپ نے اس کو حضرت ثابت کے حوالہ کر دیا تاکہ اس کے احسان کا بدلہ ادا کر دیں۔ اور عَمرو بن سعد کو اس لیے چھوڑا کہ جب بنی قُرَیظہ حضور کے ساتھ بدعہدی کر رہے تھے اُس وقت یہی شخص اپنے قبیلے کو غداری سے منع کر رہا تھا (کتاب الاموال لابی عُبَید)۔

غزوہ بنی المُصطَلِق کے بعد جب اس قبیلے کے قیدی لائے گئے اور لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے، اس وقت حضرت جُوَیرِیہ جس شخص کے حصے میں آئی تھیں اُس کو اُن کا معاوضہ ادا کر کے آپؐ نے انہیں رہا کرایا اور پھر اُن سے خود نکاح کر لیا۔ اس پر تمام مسلمانوں نے یہ کہہ کر اپنے اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا کہ یہ "اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہو چکے ہیں۔ اس طرح سَو خاندانوں کے آدمی رہا ہو گئے (مُسنَد احمد۔ طبقات ابن سعد۔ سیرت ابن ہشام)۔

صلح حُدَیبیہ کے موقع پر مکہ کے ۸۰ آدمی تنعیم کی طرف سے آئے اور فجر کی نماز کے قریب انہوں نے آپ کے کیمپ پر اچانک شب‌خون مارنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے اور حضورؐ نے سب کو چھوڑ دیا تاکہ اس نازک موقع پر یہ معاملہ لڑائی کا موجب نہ بن جائے (مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، مُسنَد احمد)

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے چند آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے تمام اہلِ مکہ کو بطورِ احسان معاف کر دیا، اور جنہیں مستثنیٰ کیا تھا اُن میں سے بھی تین چار کے سوا کوئی قتل نہ کیا گیا۔ سارا عرب اس بات کو جانتا تھا کہ اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کیے تھے۔ اس کے مقابلہ میں فتح پا کر جس عالی حوصلگی کے ساتھ حضورؐ نے ان لوگوں کو معاف فرمایا اس سے اہلِ عرب کو یہ اطمینان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل ہو گیا کہ ان کا سابقہ کسی جبّار سے نہیں بلکہ ایک نہایت رحیم و شفیق اور فیاض رہنما سے ہے۔ اسی بنا پر فتحِ مکہ کے بعد پورے جزیرۃ العرب کو مسخر ہونے میں دو سال سے زیادہ دیر نہ لگی۔

جنگِ حُنین کے بعد جب قبیلۂ ہوازِن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے حاضر ہوا تو سارے قیدی تقسیم کیے جا چکے تھے۔ حضورؐ نے سب مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا یہ لوگ تائب ہو کر آئے ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ ان کے قیدی ان کو واپس دے دیے جائیں۔ تم میں سے جو کوئی بخوشی اپنے حصے میں آئے ہوئے قیدی کو بلا معاوضہ چھوڑنا چاہے وہ اس طرح چھوڑ دے، اور جو معاوضہ لینا چاہے اس کو ہم بیت المال میں آنے والی پہلی آمدنی سے معاوضہ دے دینگے۔ چنانچہ چھ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے اور جن لوگوں نے معاوضہ لینا چاہا انہیں حکومت کی طرف سے معاوضہ دے دیا گیا۔ (بخاری، ابوداؤد، مسند احمد، طبقات ابن سعد)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم ہو چکنے کے بعد حکومت قیدیوں کو خود رہا کر دینے کی مجاز نہیں رہتی، بلکہ یہ کام اُن لوگوں کی رضامندی سے، یا ان کو معاوضہ دے کر کیا جا سکتا ہے جن کی ملکیت میں قیدی دیئے جا چکے ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام کے دَور میں بھی بطورِ احسان قیدیوں کو رہا کرنے کی نظیریں مسلسل ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اَشعث بن قَیس کِندی کو رہا کیا، اور حضرت عمرؓ نے ہُرمُزان کو اور مَنَاذِر اور مَیسان کے قیدیوں کو آزادی عطا کی (کتاب الاموال لابی عُبَید)۔

(۹) مالی معاوضہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صرف جنگِ بدر کے موقع پر ملتی ہے جبکہ فی قیدی ایک ہزار سے ۴ ہزار تک کی رقمیں لے کر ان کو رہا کیا گیا (طبقات ابن سعد۔ کتاب الاموال)۔ صحابۂ کرام کے دَور میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور فقہائے اسلام نے بالعموم اس کو ناپسند کیا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم روپیہ لے کر دشمن کے ایک آدمی کو چھوڑ دیں تاکہ وہ پھر ہمارے خلاف تلوار اٹھائے۔ لیکن چونکہ قرآن میں فدیہ لینے کی اجازت دی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس پر عمل بھی کیا ہے، اس لیے ایسا کرنا مطلقاً ممنوع نہیں ہے۔ امام محمد السِیَرُ الکبیر میں کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو اس کی ضرورت پیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئے تو وہ مالی معاوضہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔

(۱۰) کوئی خدمت لیکر چھوڑنے کی مثال بھی جنگ بدر کے موقع پر ملتی ہے۔ قریش کے قیدیوں میں سے جو لوگ مالی فدیہ دینے کے قابل نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے حضورؐ نے یہ شرط عائد کر دی کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ (مسند احمد، طبقات ابن سعد، کتاب الاموال)

(۱۱) قیدیوں کے تبادلے کی متعدد مثالیں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک مہم پر بھیجا اور اس میں چند قیدی گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک نہایت خوبصورت عورت بھی تھی جو حضرت سلمہ بن اکوعؓ کے حصے میں آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باصرار اس کو حضرت سلمہ سے مانگ لیا اور پھر اسے مکہ بھیج کر اس کے بدلے کئی مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا (مسلم، ابوداؤد، طحاوی، کتاب الاموال لابی عبید، طبقات ابن سعد) حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلۂ ثقیف نے مسلمانوں کے دو آدمیوں کو قید کر لیا۔ اس کے کچھ مدت بعد ثقیف کے حلیف قبیلے، بنی عقیل کا ایک آدمی مسلمانوں کے پاس گرفتار ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کو طائف بھیج کر اس کے بدلے ان دونوں مسلمانوں کو رہا کرا لیا۔ (مسلم، ترمذی، مسند احمد) فقہاء میں سے امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد تبادلۂ اسیران کو جائز رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا ایک قول یہ ہے کہ تبادلہ نہیں کرنا چاہیے، مگر دوسرا قول ان کا بھی یہی ہے کہ تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ جو قیدی مسلمان ہو جائے اسے تبادلہ میں کفار کے حوالہ نہ کیا جائے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں ایک ایسا وسیع ضابطہ بنایا ہے جس کے اندر ہر زمانے اور ہر طرح کے حالات میں اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی گنجائش ہے۔ جو لوگ قرآن مجید کی اس آیت کا بس یہ مختصر سا مطلب لے لیتے ہیں کہ جنگ میں قید ہونے والوں کو "یا تو بطور احسان چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے"، وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ جنگی قیدیوں کا معاملہ کتنے مختلف پہلو رکھتا ہے، اور مختلف زمانوں میں وہ کتنے مسائل پیدا کرتا رہا ہے اور آئندہ کر سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com